— عالمِ اسلام، حالات و واقعات کے آئینے میں —

عربوں میں فکری انتشار پھیلانے کی تحریک

(جناب خلیل حامدی صاحب)

لبنان سیاسی اور علمی لحاظ سے پوری ایک صدی سے عالمِ عرب پر اپنے غیر معمولی اثرات ڈال رہا ہے۔ دنیائے عرب کی تمام فکری اور اجتماعی تحریکوں کا آغاز لبنان کے دارالحکومت بیروت سے ہوا ہے ۱۸۶۶ء میں بیروت میں سیرین انجیل کالج (الکلیۃ السوریۃ الانجیلیۃ) قائم کیا گیا تھا جو اب امریکن یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے۔ عربوں کے تعلیم یافتہ طبقے میں مغربی تہذیب اور مغربی ذہن و فکر کو فروغ دینے میں اس ادارے نے بے پناہ کردار ادا کیا ہے۔ ترکوں کے خلاف عربوں کی قومی تحریک کے بیج بھی اسی ادارے نے بوئے۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد اشتراکی ممالک نے بھی شرقِ اوسط میں اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کے لیے لبنان ہی کو اپنا مرکز بنا لیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ لبنان مغربی استعمار اور اشتراکی بلاک دونوں کی کشمکش کی آماجگاہ بن چکا ہے اور دونوں کیمپوں کے حامی عناصر اپنے اپنے اثرات کو بڑھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ جہاں تک اسلام اور اسلامی تاریخ اور خالص عربی تہذیب و ثقافت کا تعلق ہے یہ دونوں کیمپ اس کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں۔ اس وقت صرف بیروت میں کمیونسٹ عناصر کی طرف سے ۱۶ اخبارات اور رسائل نکل رہے ہیں اور شرقِ اوسط میں بائیں بازو کے کیمپ کو بھرپور غذا فراہم کر رہے ہیں۔ نشر و اشاعت کے متعدد ادارے اور فکری رہنمائی کے بے شمار مراکز ان کے علاوہ ہیں جو اسلام کے خلاف کام کر رہے ہیں۔

جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد عرب عوام میں یہ ذہن ابھر آیا تھا کہ عربوں کی شکست کی اصل وجہ ان کی دینی اور اخلاقی کمزوری ہے۔ مراکش کے شاہ حسن ثانی نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ہم خدا سے دور

ہو گئے ہیں، اس لیے خدا نے بھی اپنی رحمت سے ہمیں محروم کر دیا ہے"۔ کویت کے شیخ نے بھی اس شکست کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کیا تھا۔ اس نقطۂ نظر کا اُبھر آنا مغربی استعمار کے لیے بھی ناقابلِ قبول تھا اور اشتراکی عناصر کے لیے بھی۔ شام کے بعثی کوچہ گردوں نے بھی اس نقطۂ نظر پر ناک بھوں چڑھائی اور عراق کے بعثی بھی اس پر بوکھلا اٹھے۔ خود اسرائیل اور اس کے ایجنٹ بھی نہیں چاہتے کہ کامیابی اور ناکامی کو اسلام سے وابستہ کیا جائے اور پھر اس کے نتیجے میں عربوں کے اندر جہاد کا وہ جذبہ اُبل پڑے جو صلاح الدین ایوبیؒ کی رُوح کو دوبارہ زندہ کر دے، جس نے حطّین کے مقام پر آخری کامیاب جنگ لڑ کر بیت المقدس کو صلیبی طاقتوں سے آزاد کروالیا تھا یا امیر قطز کی یاد تازہ ہو جائے جس نے عین جالوت کے معرکے میں غیر معمولی جانبازی دکھا کر مصر اور شرقِ اوسط کو تاتاری یلغار سے بچا لیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۷ء کے بعد سے آج تک مسلسل یہ کوششیں کی جارہی ہیں کہ مذہب کو مسئلۂ فلسطین سے بے تعلق رکھا جائے۔ وارفتہ مزاج، پراگندہ خیال اور ژولیدہ فکر لوگوں کا ایک گروہ برابر مذہب کی بیخ کنی اور مذہب پر طرح طرح کے حملے کرنے میں مصروف ہے۔ شام کا ایک اشتراکی ڈاکٹر صادق جلال العظم، لبنان کا عیسائی مفکر ندیم البیطار اور الجزائر کا مفرور کمیونسٹ کاتب یاسین اس گروہ کے سرخیل ہیں۔ لبنان کی سوشلسٹ صحافت اور بالخصوص روزنامہ النہار اور روزنامہ موافقف اور دار الطلیعہ پبلشنگ ہاؤس کی مطبوعات اس کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

صادق العظم کا مذہب پر حملہ | دار الطلیعہ کی طرف سے حال ہی میں مارکس کے ایک شیدائی صادق جلال العظم کی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام ہے: "نقد الفکر الدینی" (مذہبی افکار پر تنقید)۔ اس کتاب میں مصنف نے آسمانی مذاہب اور خاص طور پر اسلام کی بڑے گستاخانہ انداز میں تضحیک کی ہے۔ ۲۳۰ صفحات کی اس کتاب کا ایک ایک باب اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات کے خلاف مصنف کی زہر افشانیوں اور ہرزہ سرائیوں سے بھرا ہوا ہے۔ مصنف قرآن کریم کی آیت وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ، قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا (اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نہ کیا اور کہنے لگا کیا میں اُسے سجدہ کروں جسے

تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے'' کو نقل کرتا ہے اور پھر بڑے تحکمانہ انداز کے ساتھ لکھتا ہے کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ ابلیس نے جب سجدہ سے انکار کر دیا تو اللہ نے اُسے جنت سے جلاوطن کر دیا، اور پھر مصنف خود ہی یہ سوال اٹھا دیتا ہے کہ کیا یہ واقعہ (نعوذ باللہ) مذہبی خرافات میں سے نہیں ہے؟ اور پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر اس واقعہ کو پوری طرح صحیح مان لیا جاتے اور کائنات اور انسانی تاریخ کی بھی حقیقت تسلیم کر لی جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس واقعہ میں اور علمی تحقیق میں کھلا تضاد پایا جاتا ہے۔ اور اگر انسانی تاریخ اس واقعہ کے برعکس ہے تو پھر یہ واقعہ نہیں ہے بلکہ ایک حسین دیو مالائی کہانی ہے۔ ایک اور عنوان کے تحت مصنف اسلام اور سائنس کا موازنہ کرتا ہے اور جنت، ملائکہ اور ابلیس وغیرہ سے متعلق قرآنی آیات نقل کر کے آخر میں یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ تمام چیزیں اسی طرح کی ''خرافات'' (نعوذ باللہ منہا) ہیں جس طرح کی خرافات یونان کے دیوتاؤں، سمندری دُلھن، چڑیلوں اور عنقا پرندہ کے متعلق مشہور ہیں۔ یہ نتیجہ نکالنے کے بعد مصنف ان بنیادی عقائد پر بار بار حملے کرتا ہے اور وہی کردار ادا کرتا ہے جو اخوان الصفا کے مصنفین نے ادا کیا ہے۔ ''المیہ ابلیس'' کے عنوان کے ضمن میں مصنف شیطان کے ساتھ انتہائی اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ لکھتا ہے: ''کہا جاتا ہے کہ ابلیس بڑا مقرب فرشتہ تھا، اور ملاءِ اعلیٰ کے اندر اُسے بڑی اونچی حیثیت حاصل تھی، مگر اُس نے جب خدا کی نافرمانی کی تو خدا نے اُسے جنت سے باہر نکال دیا اور اُس پر ابدی لعنت کی۔ اور اگر خدا ان تمام چیزوں کا بنانے والا ہے اور خیر اور شر کا پیدا کرنے والا ہے تو پھر اُس نے لوگوں سے یہ مطالبہ کیوں کیا کہ وہ ابلیس کو شر کا سرچشمہ سمجھیں۔ اور جن انسانوں کو خدا نے شر کے لیے پیدا کیا ہے اور اُن کے ہاتھوں شر جاری کیا ہے تو آخر ان لوگوں کے شر کا بوجھ ابلیس پر کیوں ڈال دیا گیا ہے''۔ یہ بیان کرنے کے بعد مصنف ہرزہ سرائی پر اُتر آتا ہے اور لکھتا ہے کہ ''مکّاری خدا کی ایک صفت ہے'' (نعوذ باللہ منہا الف مرۃ)۔ اسی موضوع پر وہ مزید بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اللہ نے ازل سے یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون دوزخی۔ اور اس کے باوجود اللہ نے رسول بھیجے، کتابیں نازل کیں اور انہیں امر اور نہی سے بھر دیا اور حلال و حرام کی پابندیاں عائد کیں''۔ آخر میں نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ ''رسولوں کا بھیجنا، کتابوں کا نازل کرنا اور حلال اور حرام کے احکام بتانا یہ

سب کچھ خدا کی مکاری کے ہتھکنڈے ہیں (استغفر اللہ)، وہ ان ہتھکنڈوں کے ذریعہ انسانوں پر اپنی مشیت کے احکام نافذ کرنا چاہتا تھا" اس کے بعد مصنف مشورہ دیتا ہے کہ "ہمارا فرض ہے کہ ہم ابلیس کا وقار بحال کریں، اور اس کو حسبِ سابق فرشتہ تسلیم کریں، اور اُسے گالی گلوچ دینے سے پرہیز کریں، اُسے معاف کردیں، اور اگر اب تک اُس پر بہتان تراشی کرتے رہے ہیں اور اُسے تمام نقائص و عیوب کا ذمہ دار گردانتے رہے ہیں تو اب لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ ابلیس بڑا نیک ہے۔"

شیطان کے یارِ غار اور مرید صادق ڈاکٹر صادق جلال العظم نے عیسائیت پر بھی اسی نوعیت کی تنقید کی ہے اور انتہائی شر انگیز انداز کے ساتھ خدا کا مذاق اڑایا ہے۔

مسلمانوں کا شدید ردِ عمل اس کتاب کے خلاف سب سے پہلے بیروت کے اسلام پسند جریدہ ہفت روزہ الشہاب اور اخوان المسلمون کے حلقوں نے احتجاجی آواز اٹھائی اور مسلم عوام کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔ لبنان کے مفتی شیخ خالد حسن جو لبنان کی سنّی کونسل کے صدر بھی ہیں، کی طرف سے ایک فتویٰ صادر ہوا جس میں مصنف کو مرتد اور خارج از اسلام قرار دیا گیا۔ اور مصنف اور ناشر کو قرار واقعی سزا دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ لبنانی حکومت نے مسلمانوں کے مسلسل احتجاج اور مطالبے کے پیشِ نظر مصنف کو مذہبی شعائر کی توہین کے الزام میں فوجداری قوانین کی دفعہ ۳،۷ اور مطبوعات کے قانون کی دفعہ ۶۲ کے تحت ۸ جنوری ۱۹۷۰ء کو گرفتار کرلیا اور ۱۵ جنوری کو ایک ہزار لبنانی پونڈ کی ضمانت پر رہا کردیا۔ اس کارروائی کے خلاف لبنان کے تمام مغرب پرستوں اور سوشلسٹوں اور قوم پرستوں نے سخت اودھم مچا دیا۔ ان لوگوں کی نگاہ میں حکومت کا یہ اقدام فکر و رائے کی آزادی کے خلاف ہے۔ امریکن یونیورسٹی سے لے کر تمام کمیونسٹ اور دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اخبارات نے کئی روز تک صفِ ماتم بچھائے رکھی اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ وہ ایسے تمام قوانین کو ختم کردے جو "دقیانوسی ہوں" اور آزادیٔ اظہار پر پابندی عائد کرنے والے ہوں۔ ان لوگوں نے آزادیٔ فکر کے نام سے لبنانی دستور اور لبنانی قانون پر بڑی تند و تیز تنقیدیں کی ہیں۔

اُدھر بیروت میں مجلسِ امورِ اسلامی کے دفتر میں لبنان کی اسلامی تنظیموں نے ایک اسلامی کانفرنس

منعقد کی اور کتاب اور مصنّف اور ناشر تینوں کے خلاف ضروری کارروائی کی تکمیل کا مطالبہ کیا۔ اس کے جواب میں لبنان کی سوشلسٹ پروگریسو پارٹی (الحزب التقدمی الاشتراکی) کے صدر کمال جُنبلاط جو آج کل وزیرِ داخلہ ہیں، اخوان المسلمون اور لبنان کے اسلامی محاذ پر برس پڑے اور اُن پر الزام لگایا کہ یہ لوگ ڈاکٹر صادق العظم کے مسئلہ کو ہوا دے رہے ہیں۔ مگر اس بیان میں انہوں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ابھی تک انہوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے۔ کمال جنبلاط کے اس بیان پر سب سے بہتر تبصرہ ماونٹ لبنان کے مفتی شیخ جوزو نے کیا ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا ہے:

"کمال جنبلاط کا یہ انکشاف بڑا اہم ہے کہ ڈاکٹر صادق العظم کی علمی تحقیق کو سیاسی رنگ دیا جا رہا ہے، اور اس کی آڑ میں عرب قومیت کی تحریک، عرب سوشلزم اور مارکسزم اور سوویت یونین پر حملے کیے جا رہے ہیں۔ کمال جنبلاط نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ اس معاندانہ تحریک کی پُشت پر امریکہ کا محکمۂ جاسوسی اور اخوان المسلمون اور بعض تیل پیدا کرنے والے ممالک کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ لیکن میں کمال جنبلاط کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ عوام اس حد تک بے وقوف نہیں ہیں کہ وہ آپ جیسے شخص کے الزامات پر کان دھریں جو نہ اسلام کا قائل ہے نہ عیسائیت کا اور نہ دروزی مذہب کا بلکہ اُسے بھارت کی بُت پرستی مرغوب ہے۔ کمال جنبلاط جب ۱۹۵۴ء میں امریکہ گیا تھا تو اُس نے اپنے تاثرات میں لکھا تھا کہ امریکہ کا نظام، امریکہ کی مشینی طاقت اور ڈالر کی حکمرانی کائنات کی طاقتوں کو اس قدر تصرف میں لا رہی ہے کہ توریت کے دس احکام کی جھلک سامنے آجاتی ہے، اور امریکہ کی مادی ترقی عہد نامہ جدید کی عکاس ہے۔ اور آج کل جنبلاط مارکس کو انبیاء پر فوقیت دیتا ہے۔"

کمال جُنبلاط کے بارے میں یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ ان کا تعلق دُروزی فرقہ سے ہے اور یہ لبنان کے سوشلسٹوں کی معروف رہنما سمجھے جاتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کی پاکستان و بھارت جنگ میں انہوں نے ہندوستان کے لیے امدادی فنڈ جمع کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی اور بیروت میں ایک کمیٹی تشکیل کی تھی جس کے یہ خود ہی صدر تھے۔ اور اب گاندھی کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر بیروت میں جو کمیٹی تشکیل دی گئی ہے اُس کے ایک ممبر یہ بھی

ہیں۔ اور گاندھی کی خدمات پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ اسلامی کانفرنس نے کمال جنبلاط کے رویتے پر شدید غم وغصہ کا اظہار کیا ہے اور اُن پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ آزادیٔ فکر کی آڑ میں فتنہ انگیزی کر رہے ہیں اور الحاد و انار کی کو رواج دے رہے ہیں۔ ایک طرف اس سوشلسٹ لیڈر کا یہ حال ہے کہ جس کتاب میں آسمانی مذاہب اور اسلامی تعلیمات کی کھلم کھلا دھجیاں اڑائی گئی ہیں اور جس نے لبنان کے مذہبی حلقوں میں اضطراب و قلق کا طوفان مچا دیا ہے اُس سے تو آزادیٔ فکر کے نام پر اغماض برتتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان کی پختہ زُنّاری کا یہ حال ہے کہ بیروت کا ایک ہفت روزہ "الجدید" شام کے بعض رہنماؤں پر ایک تنقیدی مضمون چھاپتا ہے اور دلائل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ان رہنماؤں نے جون ۶۷ء کی جنگ میں نہایت افسوسناک رویہ اختیار کیا اور جولان کی پہاڑیاں دانستہ اسرائیل کے حوالے کر دیں، تو اس پر کمال جنبلاط صاحب نہ صرف یہ کہ الجدید کو چند روز کے لیے بند کر دیتے ہیں بلکہ خود شام پہنچ کر بعض رہنماؤں سے معافی مانگتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں سوشلسٹ لیڈر کی نگاہ میں خدا اور انبیاء کی توہین کوئی اہمیت نہیں رکھتی، البتہ ایک شکست خوردہ جنرل احمد سویدانی (جولان کی پہاڑیوں کے محاذ پر شامی فوجوں کے قائد) کی ذات اس قدر محترم ہے کہ اس پر کسی کو تنقید کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

بہر حال لبنان کے اسلام پسند حلقے اور مذہب پرست مسلمان ستائش و تحسین کے مستحق ہیں کہ ان کے بھرپور احتجاج کے نتیجے میں مصنف کی گرفتاری عمل میں آگئی اور اس کے خلاف بیروت کی تحقیقاتی عدالت میں مقدمہ دائر ہو گیا۔ اس عدالت کی طرف سے مصنف پر فردِ جرم بھی عائد کر دی گئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ چونکہ مصنف نے اسلام پر بھی حملے کیے ہیں، عیسائیت کو بھی رگیدا ہے اور ملکی قانون کی خلاف ورزی بھی کی ہے، اور فرقہ پرستی کے نعرے کو بھی ہوا دینے کی کوشش کی ہے لہٰذا اسے ایک سال سے لے کر ۳ سال تک قید کی سزا اور ۵۰ سے لے کر ۲۰۰ تک شامی پاؤنڈ جرمانہ کی سزا دی جانی چاہیے۔ کتاب کے ناشر کو اس جرم میں برابر کا حصہ دار قرار دیا ہے۔ بیروت کے روزنامہ الحیاۃ نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر صادق العظم دماغی مریض ہے۔ اور اسے تصرفاتِ ناروا کی بنا پر متعدد یونیورسٹیوں سے خارج کیا جا چکا ہے۔ مگر حیرت ہے کہ ایسا دماغی مریض بھی اگر ایک بے سروپا کتاب لکھ دیتا ہے تو عربوں کے سوشلسٹ حلقے اُسے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں

اور اُس کے دفاع پر اپنی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔

لبنان میں مغربی طاقتوں کی در اندازی کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کی اکثریت بھی مغربی تہذیب سے بُری طرح متاثر ہے۔ مگر یہ بات بحد قابلِ تحسین ہے کہ ایک گمراہانہ کتاب کے خلاف جب مسلمانوں نے واویلا کیا ہے تو حکومت کی طرف سے اس کا نوٹس لیا گیا ہے اور مصنف کے لیے سزا تجویز کی گئی ہے۔

الجزائری کمیونسٹ کی تجاویز: صادق العظم کے دو اور سرگرم ساتھیوں کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک کاتب یاسین ہے۔ یہ الجزائر کا رہنے والا ہے۔ مگر الجزائر کو ترک کر کے اب شرقِ اوسط کے سوشلسٹ حلقوں میں کام کر رہا ہے۔ الجزائر کو ترک کرنے کی وجہ اُس نے یہ بیان کی ہیں کہ "الجزائر کے انقلاب نے مذہب کی پوری طرح بیخ کنی نہیں کی ہے بلکہ مذہب کے ساتھ کسی حد تک مصالحت کر رکھی ہے" (الجدید، بیروت ۱۹ دسمبر ۱۹۶۹ء)۔ اس نے حال ہی میں بیروت کے روزنامہ النہار (شمارہ ۳ اکتوبر ۱۹۶۹ء) میں "آزادیٔ وطن" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ اس کی نگاہ میں آزادیٔ وطن کا مفہوم یہ ہے:

"اُس وقت تک وطن کی آزادی کوئی حیثیت نہیں رکھتی جب تک رجعت پسند عناصر اور مذہبی خیالات کی اچھی طرح بیخ کنی نہ کر دی جائے۔ چنانچہ ہمیں یعنی اشتراکیت کے علمبرداروں کو مذہب کے خلاف فیصلہ کن کشمکش برپا کرنی چاہیے۔ ہر وہ انقلاب جو مذاہب و ادیان کا خاتمہ نہیں کرتا وہ اپنے مزاج سے غداری کرتا ہے یعنی وہ اصل وطن پرستانہ انقلاب نہیں ہے۔"

روزنامہ النہار کے ۷ دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے سے کاتب یٰسین نے قرآن کریم اور آسمانی تعلیمات کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رکھا ہے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عوام الناس کی توجہات کو اصل مسئلہ سے ہٹا کر اس طرح کے مسائل میں اُلجھا دیا جائے اور قوم کی فکری اور مادی طاقتوں کو یہودیوں کے خلاف صرف کرنے کے بجائے داخلی جنگ میں جھونک دیا جائے۔

عربوں کی شکست پر ایک سوشلسٹ لیڈر کا تبصرہ لبنانی سکالر ندیم البیطار جو اس وقت سوشلسٹ عربوں کا عقلِ مفکر" بنا ہوا ہے، اُس کی کتاب "من النکسۃ الی الثورۃ" کو ترقی پسند حلقے وسیع پیمانے پر پھیلا رہے ہیں۔ ندیم البیطار نے اسرائیل کی کامیابی اور عربوں کی شکست پر (جسے وہ شکست نہیں بلکہ "پسپائی" سے تعبیر کرتا ہے)، جو تبصرہ کیا ہے اس کے چیدہ چیدہ حصّے ملاحظہ ہوں:

"عربوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ انہیں دو باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنی ہو گی، انہیں عربوں کی روایت پرستی کا خاتمہ کرنا ہو گا یا پھر صہیونی سامراج کو باقی رکھنا ہو گا۔ وہ جان لیں کہ پہلی چیز یعنی روایت پرستی کا خاتمہ دوسری چیز یعنی صہیونی سامراج کے خاتمہ کی بنیادی شرط ہے" (ص ۱۳۸)

"روایت پرستی" سے ندیم البیطار کی مراد عربوں کی مذہب پرستی، مذہبی تعلیمات اور اسلامی تاریخ ہے۔ گویا ندیم البیطار کی نظر میں اسرائیل کا وجود صرف اس بنا پر قائم ہے کہ عربوں کے اندر مذہب کے ساتھ وابستگی پائی جاتی ہے جس روز عرب مذہب سے ہاتھ اٹھا لیں گے صہیونیت مٹ جائے گی۔ ندیم البیطار اپنے مذکورہ بالا مشورے کا ثبوت یہ پیش کرتا ہے کہ:

"عرب قوم نے سامراج کے خلاف جتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں اور جتنی تہذیبی تبدیلیاں برپا کی ہیں وہ سب عرب قومیت کی برکت سے کی ہیں۔ مذہب کے طفیل نہیں کیں۔ بلکہ عربوں نے دین کے نام سے جتنی جنگیں لڑی ہیں وہ ناکام ہوئی ہیں" (ص ۱۹۳)

یعنی بدر، احد، خندق اور مکہ کے غزوات، قادسیہ کی جنگ، افریقہ کی فتوحات، اندلس کی فتح، حطّین کی جنگ، ان سب موقعوں پر ندیم البیطار کی رائے میں عربوں نے شکست کھائی ہے۔ البتہ ترکوں کے مقابلے میں عرب قوم پرستوں کی انقلابی تحریکیں کامیاب رہی ہیں کیونکہ ان تحریکوں کے نتیجے میں عرب قوم پرستوں نے شام اور لبنان فرانس کو دے دیا تھا، اور عراق، اردن اور فلسطین انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ۱۹۵۶ء کی جنگ سویز اور پھر ۱۹۶۷ء کی جنگ میں بھی عرب قومیت نے فتح کا پھریرا لہرایا ہے! ایک اور جگہ ندیم البیطار عرب نوجوانوں کو بتاتا ہے کہ

"وہ تمام سیاسی تحریکیں جو مذہب کے نام پر برپا ہوئی ہیں، قدامت پسندانہ تحریکیں تھیں۔

ان کا اصل نصب العین یہ تھا کہ عربوں کے اندر کوئی تہذیبی تبدیلی رونما نہ ہو۔ وہابیوں کی تحریک ہو یا سنوسیوں کی جماعت، ادریسی درویش ہوں یا اخوان المسلمون کے لوگ، یہ تمام رجعت پسند تھے۔ ان تحریکوں نے ترکوں کی مخالفت کی، مگر حریت اور آزادی کے ساتھ محبت کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس بنا پر کہ ان تحریکوں کے خیال میں عثمانی ترک دین سے منحرف ہو گئے تھے اور انہوں نے مغرب کے طور طریقوں کو اختیار کرنا شروع کر دیا تھا" (ص ۱۹۲)

ندیم البیطار اسرائیل کے خلاف جنگ لڑنے اور تمام عسکری قوت کو یہودیوں کے توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف مجتمع کرنے کے بجائے عربوں کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ پہلے رجعت پسندانہ ممالک کی سرکوبی کی جائے۔ اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"معاملہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد بھی جوں کا توں ہے۔ ہماری نظر میں یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم سعودی عرب میں، خلیج عربی کی ریاستوں میں، لیبیا اور تونس و مراکش میں پائے جانے والے استعمار کا مقابلہ کریں۔ مگر ۱۹۶۷ء کی پسپائی کے باوجود عربوں کی انقلابی تحریک کو وہ طاقت اور تنظیم حاصل نہیں ہوتی جو مذکورۂ بالا ممالک میں سامراج کے خلاف مزاحمت کو جاری رکھ سکے۔ حالانکہ مقبوضہ فلسطین کو آزاد کرانے کے لیے ہم جو جنگ لڑ رہے ہیں اُس کا یہ جز نہایت اہم ہے کہ ہم ان سامراج پرست عرب ملکوں کے خلاف مزاحمت کی تحریک جاری رکھیں" (ص ۶۵)

یہ سوشلسٹ فلاسفر ایک طرف عرب اسرائیل جنگ کو ایک نئی شکل میں ڈھالنا چاہتا ہے اور عربوں کی فوجوں اور اسلحہ کا رُخ اسرائیل کے بجائے خود عربوں کی طرف ہی موڑ دینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہ اسرائیل کے خلاف عربوں کے اندر جہاد کی تحریک کی سخت مخالفت کرتا ہے:

"ہماری انقلابی تحریک کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو وہ اپیلیں ہیں جن میں "جہاد" کی دعوت دی جا رہی ہے اور جہاد کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ یہ اپیلیں بعض انقلابی ممالک کے دارالحکومتوں سے بھی صادر ہو رہی ہیں۔ بہر حال جس انجام کی وہ مستحق تھیں اُس کو پہنچ گئی ہیں۔" (ص ۱۵۶)

جنگ کے بعد جامعہ ازہر کے بعض علماء کی طرف سے جہاد کے لیے جو اپیل کی گئی تھی ندیم البیطار اُس پر چین بجبیں ہے۔ جس طرح صلیبی عناصر کو سب سے زیادہ اگر کسی لفظ سے چڑ ہے تو وہ لفظ جہاد ہے، اسی طرح عربوں کے ترقی پسند حلقے بھی اس لفظ کا اعادہ گوارا نہیں کرتے۔

مذہبی عقائد پر حملہ | امورِ غیبیہ یعنی خدا کے وجود، رسالت، آخرت، ملائکہ اور جنت و دوزخ پر ایمان کو ندیم البیطار پسماندگی کا دوسرا نام قرار دیتا ہے اور ترقی کے لیے کفر و الحاد کی دعوت پیش کرتا ہے۔ ترقی اور پسماندگی کے بارے میں اُس کا تجزیہ ملاحظہ ہو:

اُتھوپیا سے لے کر سعودی عرب اور تھائی لینڈ تک وہ ممالک ہیں جو پسماندہ ترین ممالک کہے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ ممالک ابھی تک غیبی عقائد پر مبنی نظریات کو ریاست اور معاشرے کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ مگر روس، چین اور کیوبا کو دیکھیے کہ وہ طاقتور اور برتر ممالک کی فہرست میں شامل ہیں، کیونکہ انہوں نے اِن نظریات کو مسترد کر دیا ہے۔ مغربی یورپ کے نقشہ میں بھی ہمیں یہی تقسیم ملتی ہے۔ مغربی یورپ کے وہ ممالک موجودہ تہذیبی قافلے سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں جو ابھی تک غیبی آئیڈیالوجی کو چمٹے ہوئے ہیں۔ اور روایت پرستی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً اسپین اور پرتگال۔ امریکہ کے نقشے میں بھی اِسی اصول کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ امریکہ کا پسماندہ حصہ لاطینی امریکہ ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اُس نے غیبی آئیڈیالوجی کا چولا پہن رکھا ہے" (ص ۹۳)

عراق کے مشہور فوجی مصنف جنرل محمود شیت خطاب نے اپنی ایک کتاب میں یہ بیان کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوعؓ کا طریقۂ جنگ موجودہ گوریلا جنگ سے بہت ملتا جلتا تھا۔ ندیم البیطار اس مثال کا مذاق اڑاتا ہے اور اسے "بچکانہ ذہن" کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ چی گویرا کو نمونے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ لبنان کے ایک دینی رہنما کے اس خیال کا بھی اُس نے مذاق اڑایا ہے کہ جو فرشتے غزوۂ خندق میں مسلمانوں کی مدد کے لیے اُترے تھے وہ آج بھی ہماری مدد کے لیے نازل ہو سکتے ہیں۔ ندیم البیطار اور اُس کے ہم مشرب افراد عربوں کو تو یہ سبق دیتے ہیں کہ تمہاری پسماندگی اور کمزوری کا موجب دین ہے، لہٰذا تم دین کو فارغ خطی دے دو۔ مگر جب انہیں یہ بتایا جاتا ہے کہ خود اسرائیل بھی تو دین کو دانتوں سے

پکڑے ہوتے ہے اور دن رات یہودی عوام کے اندر مذہبی تعلیمات کا پرچار کر رہا ہے لیکن بایں ہمہ تم خود اُسے پسماندہ نہیں مانتے ہو بلکہ اُس کی ترقی کی داستانیں سناتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس سوال کے سامنے اُن کا وہی حال ہو جاتا ہے جسے قرآن کریم "فبھت الذی کفر" کے لفظوں سے تعبیر کرتا ہے۔

"ہر معاملہ میں مذہب کو نہ گھسیٹا جاتے" | جنرل محمود شیت خطاب عراق کے نامور اسلامی مصنف ہیں۔ اسلامی فتوحات پر عسکری نقطۂ نگاہ سے انہوں نے متعدد ضخیم کتابیں رقم کی ہیں۔ جنگِ فلسطین پر بھی وہ اہم کتابیں لکھ چکے ہیں۔ وہ برابر اس امر پر اصرار کر رہے ہیں کہ اسرائیل کو ختم کرنے کے لیے عرب حکومتوں کو جہادِ اسلامی کا اعلان کرنا چاہیے اور نوجوانوں کے اندر اسلامی روح کو بیدار کرنا چاہیے ۱۹۴۸ء میں وہ خود بھی جنگِ فلسطین میں قائد کی حیثیت سے حصہ لے چکے ہیں۔ موصوف نے ماہنامہ الوعی الاسلامی (کویت) کے دسمبر ۱۹۶۹ء کے شمارے میں لکھا ہے:

"کل میرے پاس ایک صاحب آئے جو ایک بہت بڑے عرب ریڈیو اسٹیشن میں معروف اناؤنسر ہیں اور مجھ سے کہنے لگے کہ ایک نامی گرامی عرب مصنف نے آپ کے بارے میں کہا ہے کہ آپ اپنے ہر مضمون کو مذہب کا رنگ دے دیتے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُسی روز فلسطینی فدائیین کے ایک قائد بھی مجھ سے ملنے آئے، اور مجھے دو ٹوک لفظوں میں کہنے لگے: "آپ اپنی ہر تحریر میں مذہبی پہلو کو کیوں گھسیٹ لاتے ہیں"۔ اس معروف اناؤنسر نے جو قول نقل کیا ہے اور فلسطینی قائد نے جو تنقید کی ہے اُس کا صاف مطلب یہ ہے کہ فوجی قائد کو مذہب پرست نہیں ہونا چاہیے"۔

محمود شیت خطاب اِن ابتدائی کلمات کے بعد لکھتے ہیں: "اس فلسطینی بھائی کے ساتھ میری گہری دوستی تھی۔ اس لیے کہ وہ اس فلسطین کا باشندہ ہے جس کی محبت میرے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہے، اور ایک فاضل مفکر اور دانشور ہے۔ مگر اس کے بعد مَیں نے ہمیشہ کے لیے اس سے

دوستانہ روابط ختم کر دیئے۔ کیونکہ وہ اس وہم میں مبتلا ہے کہ دین پسماندگی کی علامت ہے اور عرب جب تک دین سے جان نہیں چھڑا لیتے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ میرا یہ قدیم فلسطینی دوست اُس عرب ملک میں رہ رہا ہے جس کی اکثریت دین سے وابستہ ہے۔ چنانچہ اُس کا بھی خیال تھا کہ اس عرب ملک کی پسماندگی کا راز بھی وہاں کے عوام کی دینداری ہے۔ مگر اُسی دوست نے مجھے یہ "بشارت" بھی دی کہ یہ ملک اب جہالت اور بوسیدہ روایات سے آزادی حاصل کرنے کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس کا ثبوت انہوں نے یہ دیا کہ وہاں یونیورسٹی کے طلبہ نے اب شراب نوشی شروع کر دی ہے۔"